ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی

پروفیسر نجات اللہ صدیقی: ایک فکری مسافر

(۲)

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی جماعت اسلامی کی product تھے۔ وہ اسی جماعت سے تادم اخیر وابستہ رہے، اگرچہ امریکی شہریت کے حوالے سے جماعت نے ان کی رکنیت شاید ختم کر دی تھی، جس کا ان کو ملال تھا، جیسا کہ ان کے بھتیجے جناب صدیق صاحب نے بتایا تھا۔ انھوں نے مولانا مودودی اور سید قطب کو بہت تفصیل سے پڑھا تھا، بلکہ مولانا مودودی سے مراسلت بھی کی اور بالمشافہ گفتگو میں بھی کیں۔ عصر حاضر میں اسلام کی ضرورتوں کا جیسا کچھ ادراک ان کو تھا، تحریک میں شاید ہی کسی کو ہو۔ راقم کے خیال میں ان کے بہت سے خیالات و افکار مولانا مودودی کی بنیادی فکر غلبۂ اسلام سے صاف اختلاف پر مبنی ہے۔ اور بعض افکار میں انھوں نے فکر مودودی پر اضافے کیے ہیں، جیسا کہ اوپر گزرا، جن کا اعتراف جماعت میں مولانا مودودی کے غالی مقلدین کبھی نہ کر سکیں گے۔[۱۲] خواتین کے پردہ اور کارگاہ حیات میں ان کی فعال شرکت سے متعلق صدیقی مرحوم اور مولانا مودودی کے خیالات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اس سلسلہ میں صدیقی اخوانی علما کی رائے اور اجتہاد کو قبول کرتے ہیں، مثلاً شیخ عبد الحلیم ابو شقہ، محمد الغزالی، وصفی عاشور ابو زید، لوئی صافی وغیرہم۔ اسی طرح مذہبی آزادی،

۱۲۔ اس سلسلہ میں راقم نے ۲۰۱۴ء میں شائع شدہ اپنی کتاب ''عالم اسلام کے مشاہیر'' (ص ۲۴۷) میں جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، وہ بالکل مناسب حال ہے:

''جماعت اسلامی میں مسلسل یہ پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ دین کو مولانا مودودی کے علاوہ کسی اور نے نہیں سمجھا اور دین کا جامع اور صحیح تصور تاریخ میں پہلی بار انھوں نے ہی پیش کیا ہے۔''

یہ کتاب ffosi.org پر بھی دست یاب ہے۔

آزادی اظہار رائے اور غیر مسلموں کو اسلامی ریاست میں وہ تمام حقوق دینے کا مسئلہ ہے جو موجوزہ زمانہ کا norm ہے، یعنی شہریت اور حقوق مدنیت میں مساوات۔ نجات صاحب اس کے قائل ہیں کہ جس طرح مسلمان غیر مسلم ریاستوں میں اپنے لیے مساوی حقوق شہریت کا مطالبہ کرتے ہیں، اسی طرح اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کو وہ سارے حقوق دینے چاہییں، جو آج تمام شہریوں کے حقوق سمجھے جاتے ہیں، جب کہ مولانا مودودی اسلامی ریاست کو ایک نظریاتی ریاست قرار دیتے ہوئے غیر مسلموں کو ریاست میں کلیدی عہدے دینے کی مخالفت کرتے ہیں۔ اسی طرح نجات صاحب کی رائے میں ارتقا (evolution) کی تھیوری کو علمی بنیادوں پر سمجھنا چاہیے، اور اس کے لیے وہ ماضی کے علمی ورثہ میں ابن مسکویہ اور رومی وغیرہ کا حوالہ دیتے ہیں، ڈارون کا نہیں۔ جمہوریت اور سیکولرزم کے بارے میں مولانا مودودی نے جس تشدد کا اظہار کیا ہے اور خواہ مخواہ جمہوریت کو حاکمیت الٰہ سے متصادم کرا دیا ہے اور جماعت کے سارے اصاغر و اکابر ابھی تک اسی راگ کو الاپ رہے ہیں۔ ''زندگی نو'' میں چھپے ایک مضمون میں نجات صاحب نے اس بارے میں لکھا ہے کہ:

> ''جمہوریت کے بارے میں ہمارے لوگ بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں، مگر جمہوریت سے دنیا میں کیا سمجھا جاتا ہے، اس پر غور کرنے کی زحمت نہیں کرتے۔ جمہوریت سے عام طور پر دنیا میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ اب صرف حکمراں ہی قانون کا مطلق سورس نہیں ہے، بلکہ عام لوگوں کو بھی ریاست کے معاملات چلانے میں کچھ عمل دخل ہے۔'' (جون ۲۰۰۴ء)

مولانا مودودی کی ٹھیٹ اور اندھی تقلید کی وجہ سے جماعت اسلامی ہند ملکی سیاست میں شرکت کے حوالے سے اپنے آپ کو ایک بند گلی میں پاتی رہی اور اس مخمصہ سے نکلنے میں اسے دہائیاں لگ گئیں۔[۱۳]

ڈاکٹر نجات صاحب کوئی چیز یونہی روا روی میں نہیں لکھتے تھے، نہ لفاظی کرتے، ان کے ہاں اصل مصادر اور ریسورسز سے بھرپور استفادہ کے ساتھ ہی عصری ضرورتوں اور مسائل کا ادراک، زمانہ سے بھرپور آگہی اور ایسی بصیرت ملتی تھی جو صرف کسی فن کے ائمہ کا خاصہ ہوتی ہے۔ وہ سامنے کی مثالوں سے اپنی بات ثابت کرتے اور دل نشیں اور عقلی انداز استعمال کرتے۔ انھوں نے انگریزی میں ''Islamic Thought'' کے نام سے ایک

۱۳۔ اس سلسلے میں مزید گفتگو کے لیے ملاحظہ ہو: مولانا سلطان احمد اصلاحی، حاکمیت الٰہ پر تنقیدی سلسلہ، جو ان کے رسالہ علم و ادب میں ۱۲ اقساط میں شائع ہوا۔ نیز ''غیر مسلم اکثریت کے ممالک میں مسلم اقلیت کا مطلوبہ کردار'' اور ''آزاد ہند میں مسلم سیاست'' شائع کردہ ادارہ علم و ادب، دارالانس ۲۱/۴ بی، نزد پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ۔

مجلہ بھی کئی برسوں تک نکالا، جو علمی و فکری حلقوں میں دل چسپی سے پڑھا جاتا تھا، خاص طور پر intellectual کلاس کے درمیان۔

راقم نے ان کو پڑھا تو بچپن سے ہی تھا، مگر کبھی ملاقات کا یا مراسلت کا خیال نہیں آیا۔ یہ غالباً بیسویں صدی کی آخری دہائی کی بات تھی، راقم نے لکھنؤ کے ایک مجوزہ اخوانی الفکر ادارہ معہد الفکر الاسلامی (مجوز مولانا ظہیر احمد صدیقی ندوی) کے ساتھ مل کر مدارس اسلامیہ کے طلبہ کے لیے ایک خصوصی تربیتی نصاب ترتیب دیا۔ اور اس کو لے کر علی گڑھ کا سفر کیا، جہاں کے علما و دانش وروں سے ایک ہفتہ تک استفادہ، مشاورت اور ملاقاتیں کیں، مگر کوئی خاطر خواہ فائدہ نہ ہوا۔ البتہ مولانا ظہیر صاحب نے یہ تربیتی کورس ڈاکٹر نجات صاحب کی خدمت میں بھی بھیج دیا تھا، جس پر ایک نپا تلا تجزیاتی اور تنقیدی جامع تبصرہ انھوں نے ایک صفحہ میں لکھ کر ارسال فرمایا۔ ان کے تبصرے نے چودہ طبق روشن کر دیے تھے۔ بس اس کے بعد دل نے شدت سے چاہا کہ ان کی خدمت میں حاضری دی جائے اور ان سے کسب فیض کیا جائے۔ چنانچہ اس کے بعد اسلامی تحریکات کی موجودہ فکر اور ان کی ناکامیوں سے متعلق ایک مراسلہ علی گڑھ کے پتا پر لکھا، جس میں مولانا مودودی کی فکر پر مولانا وحید الدین خاں وغیرہ کی تنقید کا ذکر بھی تھا۔ امید تھی کہ جواب تو شاید ہی ملے (جیسا کہ عام طور پر قائدین، علما اور دانش وروں کا اب تک کا تجربہ رہا تھا)۔ ایک ہفتہ بعد حیرت ہوئی جب علی گڑھ سے ایک فون آیا اور ادھر سے آواز آئی: ''میں نجات اللہ صدیقی بول رہا ہوں''۔ اس کے بعد انھوں نے میرے مراسلہ پر اظہار خیال کیا، ملاقات کی خواہش بھی ظاہر کی۔ قریبی زمانہ میں کسی سیمینار میں علی گڑھ جانا ہوا۔ اُس وقت علی گڑھ سے واقفیت سرسری سی تھی۔ رفیق سفر تصوف کے معروف اسکالر مفتی مشتاق تجاروی تھے، جو رابطہ عامہ کے بڑے ماہر ہیں۔ میں نے نجات صاحب کی علی گڑھ میں موجودگی کا تیقن کر لیا تھا، اُن کو فون کیا، وقت لیا اور شام کے خالی وقت میں ہم دونوں مستقر سے باہر جانے کے لیے نکلے تو مزمل منزل کی طرف جا نکلے، جس کے قریب ہی نجات صاحب کا مکان تھا۔ تجاروی صاحب کو کسی پروفیسر صاحبہ کے آستانہ پر حاضری دینی تھی، وہ مجھے نجات صاحب کے دروازے پر چھوڑ کر رفو چکر ہوئے اور میں ان کے گھر پر حاضر ہوا۔ یہ ان سے بالمشافہ پہلی دید و شنید تھی۔ تفصیل سے بات چیت ہوئی۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو کے تعاون سے جامعہ ملیہ کے شعبۂ اسلامک اسٹڈیز نے مختلف جامعات کے اسلامک اسٹڈیز کے نصاب سے متعلق ایک ورکشاپ منعقد کیا تھا۔ راقم گو اس میں شریک نہ تھا، مگر صدر شعبہ

پروفیسر اختر الواسع صاحب نے افتتاحی اجلاس میں اسے بلا لیا، جس میں کلیدی نوٹ پروفیسر نجات اللہ نے پڑھا تھا، جس کو راقم نے ماہنامہ ''افکار ملی'' میں شائع کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد راقم نے ایک مقالہ ''ہندوستان میں اسلام، مسلمان اور سیکولرزم'' کے عنوان پر لکھا اور ان کی خدمت میں روانہ کیا۔ راقم نے اس میں لکھا تھا کہ ''قرآن میں خدا کی حاکمیت تکوینی معنی میں استعمال کی گئی ہے۔ اُسے زمین پر اتار کر جمہوریت اور سیکولرزم کو اُس سے ٹکرانا مناسب رویہ نہیں۔'' نجات صاحب نے اس میں ترمیم کی اور کہا کہ ''حاکمیت الٰہ تکوینی و تشریعی، دونوں معنوں میں ہے۔'' انھی دنوں اسلام میں آزادی فکر کے موضوع پر میرا ایک مضمون ''افکار ملی'' میں شائع ہوا، جس کو انھوں نے بہت پسند کیا اور فون کر کے اس پر مبارک باد دی۔ تقریباً ایک سال بعد شاہین باغ نئی دہلی میں ان کے فلیٹ پر ملاقات ہوئی اور راقم نے ان کا ایک تفصیلی انٹرویو کیا، جس میں انھوں نے یہ اظہار خیال کیا کہ ''ایسی دینی فکر کی ضرورت ہے جو بدلتے وقت میں زمانہ کی ضرورتوں کا ساتھ دے سکے، اس کے لیے آزادی اظہار رائے کی ضرورت ہے اور جو لوگ آزادی اظہار رائے پر چیں بہ جبیں ہوں، ان کو قرون اولیٰ کے اسلامی معاشرہ کی صحت مندانہ اور صالح اقدار دوبارہ یاد دلانے کی ضرورت ہے۔''

ایک سوال کے جواب میں انھوں نے فرمایا:

''جو نصوص ہیں، ان کے جو معانی و مطالب ساتویں صدی میں لیے گئے ہیں، ضروری نہیں کہ وہ آج ڈیڑھ ہزار سال بعد بھی متعلق اور relevant ہوں۔ مثال کے طور معاشرت میں یہ تصور عام ہے کہ مرد حکمراں ہے اور عورت اس کے ماتحت۔ اس کے لیے دلیل 'اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ' (النساء ۴: ۳۴) جیسے نصوص سے دی جاتی ہے، حالاں کہ ان کا ایک مخصوص پس منظر ہے۔ آج کی دنیا میں تیز رفتار سائنس، ٹیکنالوجی اور تمدنی ترقیوں نے یہ ناممکن بنا دیا ہے کہ عورت کو مکمل طور پر مرد کے کنٹرول میں دے دیا جائے۔ آج عورت ہر میدان میں آگے بڑھنا چاہتی ہے، اس کے حوصلوں کو دبایا نہیں جا سکتا''۔ [۱۴]

اس کے بعد ان سے مسلسل ملاقاتیں اور گفتگوئیں رہیں۔ آخری جو تفصیلی ملاقات یاد ہے، اس میں رفیق محترم مولانا وارث مظہری، مولانا محمد ذکوان ندوی اور راقم خاک سار نے مشترکہ طور پر کی تھی۔ یہ بڑی یادگار ملاقات تھی اور اس میں نجات صاحب نے تفصیل سے مختلف سوالوں کے جواب دیے تھے۔ ہم لوگوں نے گروپ فوٹو بھی بنوایا جس کو مولانا ذکوان صاحب نے شوٹ کیا تھا۔ حضرت ذکوان کی اِس مہارت پر ہم لوگ حیران رہ گئے تھے۔

۱۴۔ افکار ملی، فروری ۲۰۱۴ء، نئی دہلی۔

یہ بات بھی دیکھی گئی کہ نجات صاحب بعض اوقات بعض متعین سوالوں کا جواب نہیں دیتے تھے۔ ایک ملاقات میں راقم نے ان کے سامنے ایک متعین سوال رکھا: مسلمانوں میں ایک سوچ یہ بھی پیدا ہوئی ہے کہ حکومت، اقتدار کا حصول یا اس کے لیے جدوجہد اسلام کا منشا نہیں۔ مولانا وحید الدین خاں اور جاوید احمد غامدی کے نزدیک یہ اسلام کی سیاسی تعبیر ہے (اقتدار امر موعود ہے، امر مقصود نہیں۔ وحید الدین خاں، حکومت کا نہیں امت کا تصور ہے، جمال البنا معاشرہ مقصود ہے، اقتدار نشانہ نہیں، محمود احمد غازی) آپ کیا سمجھتے ہیں؟

اس سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ کوئی رائے قائم کرنے کے دو طریقے ہیں: پہلا، استدلالی طریقہ، یعنی نصوص کو دیکھا جائے، ان پر غور و فکر کیا جائے۔ میرا خیال ہے کہ یہ کام بہت ہو چکا ہے۔ دوسرا، تجرباتی طریقہ، یعنی یہ دیکھا جائے کہ دونوں گروہوں میں (سیاسی تعبیر کے علم بردار و غیر سیاسی اصلاح کے حاملین) اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں کون آگے رہا۔ کس کا کتنا حصہ ہے اور موجودہ حالات میں کس کا contribution زیادہ ہے۔ میدانی تجربہ کیا ہے، یہ ضرور دیکھنا چاہیے۔ جہاں تک ہمارے ملک کا تعلق ہے، ہمارے ہاں یہ بحث محض اکیڈیمک ہے، عملی نہیں۔ اس ملک میں اسلامی سیاست ہمارا فوری ہدف نہیں، نہ ہی کوئی یہ بات کہہ رہا ہے۔ ''... آج سے ۷۰ سال پہلے جب مولانا مودودی اور دوسروں نے حکومت الٰہیہ یا اسلامی حکومت کی باتیں کہی تھیں، اس وقت کی صورت حال جدا تھی۔ اس وقت یہاں انگریز حکمراں تھا اور اس وقت اسلامی سیاست یا اسلام کے اقتدار کی بات سمجھ میں آتی تھی۔ اس وقت کی عبارتوں کو absolute اور مطلق معنوں میں نہیں لیا جانا چاہیے۔ نیک خواہش کی بات الگ ہے، ورنہ ابھی یہاں اسلامی اقتدار کی بات کہنا ایک بہت بعید اور بہت دور کی بات ہے۔''[۱۵] یہاں دیکھا جا سکتا ہے کہ بعض متعین سوالوں کا جواب دینے سے انھوں نے گریز کیا ہے۔ بعض حضرات نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ ڈاکٹر صاحب چاہتے تھے کہ لوگ خود آزادی کے ساتھ غور و خوض کریں اور خود کسی نتیجہ تک پہنچیں۔

مقاصد شریعت

مقاصد شریعت پر سلف میں علامہ عزالدین ابن عبد السلام، امام شاطبی غرناطی اور امام غزالی نے کلام کیا ہے۔ اس کے بعد شاہ ولی اللہ دہلوی اور شیخ الطاہر بن عاشور نے بھی اس سے اعتنا کیا۔ بیسویں صدی کے اواخر میں

۱۵۔ افکار ملی فروری ۲۰۱۴ء۔

عالمی ادارہ برائے فکر اسلامی (واشنگٹن ڈی سی)[16] نے اس موضوع کو اپنی ریسرچ اور تحقیقی سرگرمیوں کا باضابطہ محور بنایا اور اس پر مختلف زبانوں میں بہت سا لٹریچر شائع کیا اور شاطبی کے نظریۂ مقاصد کو دنیا بھر میں متعارف کرایا۔ ہندوستان میں مذکورہ ادارہ کے اشتراک سے انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز اور اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے بھی اِس کی طرف علما اور طالبان علوم نبوت کو متوجہ کیا۔ مولانا مجاہد الاسلام قاسمی، مولانا امین عثمانی اور اسلامی فقہ اکیڈمی انڈیا کے دوسرے ذمہ داروں نے اس کے لیے علمی و عملی کاوشیں کیں اور ورکشاپ و مذاکرے منعقد کیے۔ تاہم برصغیر کے علما کے لیے یہ موضوع ابھی تک خاصا غیر متعارف ہے، بلکہ زیادہ تر کو اس پر سخت تحفظات ہیں۔ پروفیسر نجات اللہ صدیقی کی مقاصد کے موضوع پر معروف کتاب ''مقاصد شریعت''[17] غالباً ان کی آخری باضابطہ تصنیف ہے، جو پہلے پاکستان سے اور اس کے بعد ہندوستان سے شائع ہوئی ہے۔ نجات صاحب نے ''مقاصد شریعت'' کا استعمال نہ صرف عصر حاضر کے بعض معاشی مسائل کے حل کے لیے کیا ہے، بلکہ بعض سلگتے ہوئے عالمی ایشوز، نیز مختلف فکری، سیاسی و سماجی مسائل کے سلسلے میں ''مقاصد شریعت'' کا حوالہ دیتے ہوئے بعض نئی رائیں ظاہر کی ہیں۔ انھوں نے یورپین افتا کمیٹی اور عالمی فقہ اکیڈمیوں کے، نیز شیخ یوسف القرضاوی وغیرہ کے بعض متنازع فیہ فتووں کا سہارا لے کر بعض ایسی رائیں بھی دیں جن پر برصغیر کے علما کا عموماً سخت موقف رہا ہے۔ اس کتاب کے خلاف بعض روایتی علما نے سخت ردعمل کا اظہار کیا اور جماعت کے بعض اکابر نے بھی غیر علمی رویوں کا اظہار کیا۔ نجات صاحب کی توجہ جب اس جانب دلائی گئی تو انھوں نے کہا کہ ''وہ ناقدین کی باتوں کو سنجیدگی سے پڑھیں گے اور اگر ان کی تنقید میں کوئی وزن محسوس ہوا تو اپنی رائے سے رجوع

۱۶۔ المعہد العالمی للفکر الاسلامی، فلسطینی نژاد امریکن مسلمان اسکالر و مفکر ڈاکٹر اسمٰعیل راجی الفاروقی شہید اور ان کے رفقا نے ۱۹۸۱ء میں واشنگٹن میں قائم کیا تھا، اس کے بعد اس کی شاخیں اور ممالک میں بھی قائم ہوئیں۔ فاروقی کے رفقا میں زیادہ معروف نام ہیں: ڈاکٹر عبد الحمید احمد ابو سلیمان اور شیخ طٰہٰ جابر العلوانی۔ اس ادارہ کی بنیادی فکر اسلامائزین آف نالج تھی، لیکن اس کے علاوہ اور بھی مختلف موضوعات پر ان حضرات نے سرگرمی سے کام کیا ہے، جن میں سر فہرست مقاصد شریعت کا موضوع بھی ہے۔

۱۷۔ یہ کتاب پہلے قسط وار اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد پاکستان کے مجلہ ''فکر و نظر'' میں شائع ہوئی۔ بعد ازاں اسی انسٹی ٹیوٹ نے اس کو کتابی شکل میں شائع کیا۔ ہندوستان میں مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔ دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

کر لیں گے۔''[۱۸]

''مقاصد شریعت'' میں انھوں نے لکھا:

''اسلام تسلط پسندی (hegemony) کو رد کرتا ہے۔ وہ اللہ کی بندگی کی طرف دعوت دیتا ہے نہ کہ مسلمانوں کی غلامی کی طرف... مکہ میں نبی ﷺ کے ۱۳ سال دعوت واصلاح وتزکیہ کے کام میں گزرے تھے نہ کہ حصول اقتدار کی مہم میں۔ مکہ میں آپ کے شب وروز کیسے گزرتے تھے اس کا اندازہ قرآن کریم کی ان سورتوں اور آیات کے مطالعہ سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے جو اس دوران نازل ہوئیں۔'' (۲۸۴، ۲۹۰)

بہر حال مقاصد شریعت پر ان کی کتاب اردو میں ایک قابل قدر اضافہ ہے اور ایک شان دار علمی و فکری خدمت، جس کا ادراک ہمارے فقہی جامد ذہن کو ابھی تک نہیں ہو سکا ہے۔

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کہتے تھے کہ اگلی صدی میں نئی اسلامی تحریک پیدا ہو گی۔ نجات صاحب کی زندگی ایک فکری مسافر کی سی ہے، جو مسلسل فکری ارتقا سے گزر رہا تھا۔ موجودہ زمانے کے مسلمان اہل فکر میں عبد الحمید ابو سلیمان اور ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی، دونوں کے ہاں یہ فکری ارتقا موجود ہے، جو اور علما و دانش وروں میں عنقا ہے۔

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کی آخری زمانہ کی دو انگریزی تحریریں خود اپنا احتساب اور اپنے علمی کاموں کے ناقدانہ جائزہ کی بہترین مثال ہیں:

۱۔ My Life in Islamic Economics۔

۲۔ Islamization of Knowledge: Reflections on Priorities۔

یہ دونوں مضمون ان کے فکری اضطراب، بتدریج فکری ارتقا اور اس راہ میں پیش آنے والی غلطیوں کے ادراک کی غمازی کرتے ہیں۔

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کی تصانیف میں تجدیدی شان پائی جاتی ہے۔ وہ وسعت مطالعہ، نشتر تحقیق اور جرأت دانش سے بہرہ ور تھے۔ ان کی فکری کاوشیں آیندہ زمانے کے لیے نقوش راہ ثابت ہوں گی:

ان کے جانے کا منظر تماشا نہیں
دور تک دیکھیے دور تک سوچیے

۱۸۔ ڈاکٹر صاحب کے بھتیجے جناب صدیق صاحب نے آن لائن تعزیتی میٹنگ میں یہ بات بتائی۔